مشتاق احمد یوسفی

(ولادت:1923ء)

اور آنا گھر میں مُرغیوں کا

عرض کیا'' کچھ بھی ہو۔ میں گھر میں مرغیاں پالنے کا روادار نہیں۔ میرا راسخ عقیدہ ہے کہ ان کا صحیح مقام پیٹ اور پلیٹ ہے اور شاید.....'' ''اس راسخ عقیدے میں میری طرف سے پتلی کا اور اضافہ کر لیجیے۔'' انھوں نے بات کاٹی۔ پھر عرض کیا'' اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی مُرغی عمر طبیعی کو نہیں پہنچ پاتی۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ ہماری ضیافتوں میں میزبان کے اخلاص و ایثار کا اندازہ مرغیوں اور مہمانوں کی تعداد اور ان کے تناسب سے لگایا جاتا ہے۔''

فرمایا'' یہ صحیح ہے کہ انسان روٹی پر ہی زندہ نہیں رہتا.....اسے مرغ مسلّم کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ اگر آپ کا عقیدہ ہے کہ خدا نے مرغی کو محض انسان کے کھانے کے لیے پیدا کیا تو مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ صاحب! مرغی تو درکنار، میں تو انڈے کو بھی دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ تازے خود کھایئے۔ گندے ہو جائیں تو ہوٹلوں اور سیاسی جلسوں کے لیے دُگنے داموں بیچیے۔ یُوں تو اس میں.....میرا مطلب ہے تازہ انڈے میں

ع ہزاروں خُوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

مگر سب سے بڑی خُوبی یہ ہے کہ پھوہڑ سے پھوہڑ عورت کسی طرح بھی پکائے یقیناً مزے دار پکے گا۔ آملیٹ، نیم برشت، تلا ہُوا حلوا.....'' اس کے بعد انھوں نے ایک نہایت پیچیدہ اور گنجلک تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ آملیٹ وغیرہ بگاڑنے کے لیے غیر معمولی سلیقہ اور صلاحیت درکار ہے جو فی زمانہ مفقود ہے۔

اختلاف کی گنجائش نظر نہ آئی تو میں نے پہلو بچا کر وار کیا'' یہ سب درست! لیکن اگر مُرغیاں کھانے پر اُتر آئے تو ایک ہی ماہ میں دڑبے کے دڑبے صاف ہو جائیں گے۔'' کہنے لگے'' یہ نسل مٹائے نہیں مٹتی۔ جہاں تک اس جنس کا تعلق ہے دو اور دو چار نہیں بلکہ چالیس ہوتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو خود حساب کر کے دیکھ لیجیے۔ فرض کیجیے کہ آپ دس مرغیوں سے مرغبانی کی ابتدا کرتے ہیں۔ ایک اعلیٰ نسل کی مرغی سال میں اوسطاً دو سو سے ڈھائی سو تک انڈے دیتی ہے لیکن آپ چونکہ فطرتاً قنوطی واقع ہوئے ہیں، اس لیے یہ مانے لیتے ہیں کہ آپ کی مُرغی صرف ڈیڑھ سو انڈے دے گی۔''

میں نے ٹوکا'' مگر میری قنوطیت کا مُرغی کے انڈے دینے کی صلاحیت سے کیا تعلق؟'' بولے '' بھئی آپ تو قدم قدم پر اُلجھتے ہیں۔ قنوطی سے ایسا شخص مراد ہے جس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں رونے کے لیے بنائی ہیں۔ خیر، اس کو جانے دیجیے۔ مطلب یہ ہے کہ اس حساب سے پہلے سال میں ڈیڑھ ہزار انڈے ہوں گے اور دوسرے سال ان انڈوں سے جو مُرغیاں نکلیں گی وہ دو لاکھ پچیس ہزار انڈے دیں گی جن سے تیسرے سال اسی محتاط اندازے کے مطابق تین کروڑ سینتیس لاکھ پچاس ہزار چوزے نکلیں

گے۔ بالکل سیدھا سا حساب ہے۔''

''مگر یہ سب کھائیں گے کیا؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔ ارشاد ہوا اس کی خوبی یہی ہے کہ اپنا رزق آپ تلاش کرتا ہے۔ آپ پال کر تو دیکھیے۔ دانہ دُنکا، کیڑے مکوڑے، کنکر پتھر چگ کے اپنا پیٹ بھر لیں گے۔''

پوچھا ''اگر مرغیاں پالنا اس قدر آسان اور نفع بخش ہے تو آپ اپنی مرغیاں مجھے کیوں دینا چاہتے ہیں۔'' فرمایا ''یہ آپ نے پہلے ہی کیوں نہ پوچھ لیا۔ ناحق ردّوقدح کی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا مکان پہلے ہی کس قدر مختصر ہے۔ آدھے میں ہم رہتے ہیں اور آدھے میں مرغیاں۔ اب مشکل یہ آپڑی ہے کہ کل کچھ عزیز چھٹیاں گزارنے آرہے ہیں۔ اس لیے.....''

اور دوسرے دن ان کے نصف مکان میں عزیز اور ہمارے گھر میں مرغیاں آ گئیں۔

اب اس کو میری سادہ لوحی کہیے یا خلوصِ نیت کہ شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ انسان محبت کا بھوکا ہے اور جانور اس واسطے پالتا ہے کہ اپنے مالک کو پہچانے اور اس کا حکم بجالائے۔ گھوڑا اپنے سوار کا آسن اور ہاتھی اپنے مہاوت کا آنکس پہچانتا ہے۔ کتا اپنے مالک کو دیکھتے ہی دُم ہلانے لگتا ہے جس سے مالک کو روحانی خوشی ہوتی ہے۔ سانپ بھی سپیرے سے ہل جاتا ہے لیکن مُرغیاں؟ میں نے آج تک کوئی مُرغی ایسی نہیں دیکھی جو کسی اور کو پہچانے اور جس کو اپنے پرائے کی تمیز ہو۔ مہینوں ان کی نگہداشت اور سنبھال کیجیے۔ برسوں ہتھیلیوں پر چگایئے۔ لیکن کیا مجال کہ آپ سے ذرا بھی مانوس ہو جائیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں یہ اُمید لگائے بیٹھا ہوں کہ میرے دہلیز پر قدم رکھتے ہی مُرغ سرکس کے طوطے کی مانند توپ چلا کر سلامی دیں گے یا چوزے میرے پاؤں میں وفادار کتے کی طرح لوٹیں گے، اور مرغیاں اپنے اپنے انڈے ''سپردم بتو مایۂ خویش را''[1] کہتی مجھے سونپ کر اُلٹے قدموں واپس چلی جائیں گی۔ تاہم پالتو جانور سے خواہ وہ شرعاً حلال ہی کیوں نہ ہو، یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ ہر چمکتی ہوئی چیز کو چھری سمجھ کر بدکنے لگے اور مہینوں کی پرورش و پرداخت کے باوجود محض اپنے جبلّی تعصّب کی بنا پر ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا تصوّر کرے۔

ایک عام خوش فہمی جس میں تعلیم یافتہ اصحاب بالعموم اور اُردو شعرا بالخصوص عرصے سے مبتلا ہیں، یہ ہے کہ مُرغ صرف صبح اذان دیتے ہیں۔ اٹھارہ مہینے اپنی عادات و خصائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یا تو میں جان بوجھ کر عین اس وقت سوتا ہوں جو قدرت نے مُرغ کے اذان دینے کے لیے مقرر کیا ہے یا یہ ادبدا کر اس وقت اذان دیتا ہے جب خدا کے گناہگار بندے خوابِ غفلت میں پڑے ہوں۔ بہرصورت ہمارے محبوب ترین اوقات اتوار کی صبح اور سہ پہر ہیں۔ آج بھی چھوٹے قصبوں میں کثرت سے ایسے خوش عقیدہ حضرات مل جائیں گے جن کا ایمان ہے کہ مُرغ بانگ نہ دے تو پو نہیں پھٹتی لہٰذا کفایت شعار لوگ الارم والی ٹائم پیس خریدنے کے بجائے مُرغ پال لیتے ہیں تاکہ ہمسایوں کو سحر خیزی کی عادت رہے۔ بعضوں کے گلے میں قدرت نے وہ سحر جلال عطا کیا ہے کہ نیند کے ماتے تو ایک طرف رہے، ان کی بانگ سُن کر ایک دفعہ تو مردہ بھی کفن پھاڑ کے اکڑوں بیٹھ جائے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں مُرغ کی آواز، اس کی جسامت کے لحاظ سے کم از کم سوگنا زیادہ ہوتی ہے۔

---

[1] میں اپنی دولت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ اگر گھوڑے کی آواز بھی اسی تناسب سے بنائی گئی ہوتی تو تاریخی جنگوں میں توپ چلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

اب یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر مُرغ اذان کیوں دیتا ہے؟ ہم پرندوں کی نفسیات کے ماہر نہیں۔ البتہ معتبر بزرگوں سے سنتے چلے آئے ہیں کہ صبح دم چڑیوں کا چہچہانا اور مُرغ کی اذان دراصل عبادت ہے لہٰذا جب مرزا عبدالودود بیگ نے ہم سے پُوچھا کہ مُرغ اذان کیوں دیتا ہے؟ تو ہم نے سیدھے سبھاؤ یہی جواب دیا کہ اپنے رب کی حمد وثنا کرتا ہے۔ کہنے لگے ''صاحب! اگر یہ جانور واقعی اتنا عبادت گزار ہے تو لوگ اسے اتنے شوق سے کیوں کھاتے ہیں؟''

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تھکا ماندہ بارش میں شرابور گھر پہنچا تو دیکھا کہ تین مُرغے میرے پلنگ پر ہیں۔ سفید چادر پر جا بجا پنجوں کے تازہ نشان تھے۔ البتہ میری قبل از وقت واپسی کے سبب جہاں جہاں جگہ خالی رہ گئی وہاں سفید دھبے نہایت بدنما معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے ذرا درشتی سے سوال کیا ''آخر یہ گلا پھاڑ پھاڑ کے کیوں چیخ رہے ہیں؟''

بولیں ''آپ تو خواہ مخواہ الرجک ہو گئے ہیں۔ یہ بیچارے چونچ بھی کھولیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے چڑا رہے ہیں؟'' میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دل نے کہا ''بس بہت ہو چکا۔ آؤ آج دوٹوک فیصلہ ہو جائے۔ اس گھر میں اب یا تو یہ رہیں گے یا میں'' میں نے بپھر کر کہا۔ ان کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو بھر آئے۔ ہراساں ہو کر کہنے لگیں ''مینہ برستے میں آپ کہاں جائیں گے؟'' اس جنس کے بارے میں ایک مایوس کن انکشاف یہ بھی ہوا کہ خواہ آپ موتی چگائیں، خواہ سونے کا نوالا کھلائیں، مگر اس کو کیڑے مکوڑے، جھینگر، بھنگے، چیونٹے اور کیچوے کھانے سے باز نہیں رکھ سکتے اور میں یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا اثر ونفوذ انڈے میں نہ ہو..... پھر موپساں کے ایک افسانے کا ہیرو اگر یہ دعویٰ کرے کہ وہ زردی کی بو سے یہ بتا سکتا ہے کہ مُرغی نے کیا کھایا تھا، تو اچنبھے کی بات نہیں۔ خود ہمارے ہاں ایسے ایسے لائق قیافہ شناس دال روٹی پر جی رہے ہیں جو ذرا سی بوٹی چکھ کے بکری کے چارے کا مفصل حال بتا سکتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ کھلی اور بھوسہ کی خاصیت اور چوپایوں کی خصلت کے پیش نظر، بعض نفاست پسند والیانِ ریاست اس بات کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ جن بھینسوں کے دودھ کی بالائی ان کے دسترخوان پر آئے، ان کو صبح وشام بادام اور پستے کھلائے جائیں تاکہ اس کا اصل ذائقہ اور مہک بدل جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عمدہ دودھ کی خوبی یہ تھی کہ اسے پی کر کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ دودھ ہے۔

ایک اور سنگین غلط فہمی جس میں خواص وعوام مبتلا ہیں اور جس کا ازالہ میں رفاہِ عام کے لیے نہایت ضروری خیال کرتا ہوں، یہ ہے کہ مُرغیاں دڑبے اور ٹاپے میں رہتی ہیں۔ میرے ڈیڑھ سال کے مختصر مگر بھرپور تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ مُرغیاں دڑبے کے سوا ہر جگہ نظر آتی ہیں اور جہاں نظر نہ آئیں وہاں اپنے ورود ونزول کا ناقابلِ تردید ثبوت چھوڑ جاتی ہیں۔ ان آنکھوں نے بارہا غُسل خانے سے انڈے اور کتابوں کی الماری سے جیتے جاگتے چوزے نکلتے دیکھے۔ لحاف سے کڑک مُرغی اور دڑبے سے شیو کی پیالی برآمد ہونا روزمرہ کا معمول ہو گیا اور یوں بھی ہوا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ مگر میرے ''ہیلو'' کہنے سے پیشتر ہی مرغ نے میری ٹانگوں کے درمیان کھڑے ہو کر اذان دی اور جن صاحب نے ازراہِ تلطُّف مجھے یاد فرمایا تھا انھوں نے ''سوری! رانگ نمبر!'' کہہ کر جھٹ فون بند کر دیا۔ قصہ مختصر چند ہی مہینوں میں اس طائرِ لاہوتی نے گھر کا وہ نقشہ کر دیا کہ اسے دیکھ کر وہی شعر پڑھنے کو جی چاہتا تھا، جو

قدرے مختلف حالات میں، حُسنا پری نے حاتم طائی کو سُنایا تھا:

یہ گھر جو کہ میرا ہے تیرا نہیں
پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

اب گھر اچھا خاصا پولٹری فارم (مُرغی خانہ) معلوم ہوتا تھا فرق صرف اتنا تھا کہ پولٹری فارم میں عام طور سے اتنے آدمیوں کے رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جو حضرات آلام دنیوی سے عاجز و پریشان رہتے ہوں، ان کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ مُرغیاں پال لیں۔ پھر اس کے بعد پردۂ غیب سے کچھ ایسے نئے مسائل اور فتنے خود بخود اٹھ کھڑے ہوں گے کہ انھیں اپنی گزشتہ زندگی جنت کا نمونہ معلوم ہوگی۔

(چراغ تلے)

مشق

1- درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں۔

i- مصنف کے خیال میں مرغی کا صحیح مقام کیا ہے؟

(کھیت، وڑبہ، پلیٹ)

ii- میزبان کے اخلاص و ایثار کا اندازہ کن باتوں سے ہوتا ہے؟

(تحفے سے، طویل قیام سے، دسترخواں پر مرغیوں کی تعداد سے)

iii- گندے انڈوں کا موزوں محلِ استعمال کیا ہے؟

(جلسہ، ٹوکری، کرکٹ میچ)

iv- مرغ کی آواز اور جسامت میں کیا تناسب ہے؟

(ایک اور دو کا، ایک اور چالیس کا، ایک اور سو کا)

2- سبق کے حوالے سے مختصر جوابات لکھیں۔ جواب تین سطور سے زیادہ طویل نہ ہو۔

i- مصنف کے دوست اپنی مرغیاں، مصنف کو کیوں دینا چاہتے تھے؟

ii- کفایت شعار لوگ مرغ کیوں پالتے ہیں؟

iii- ''اس گھر میں اب یا تو یہ رہیں گے یا میں!'' یہ جملہ مصنف نے کس موقع پر کسے کہا اور نتیجہ کیا نکلا؟

iv- مرغیوں کی پسندیدہ خوراک کیا ہے؟

v- ''سوری! رانگ نمبر'' سے مصنف کا جو تجربہ وابستہ ہے، بیان کیجیے۔

3- مندرجہ ذیل عبارات کی تشریح، حوالۂ متن اور سیاق و سباق کے ساتھ کریں۔

i- مہینوں ان کی ..... پیاسا تصور کرے۔

ii- ایک عام خوش فہمی.....غفلت میں پڑے ہوں۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں:

پردۂ غیب، راسخ عقیدہ، عمرِ طبیعی، گنجائش، خوش فہمی۔

5- مناسب الفاظ لگا کر خالی جگہ پُر کریں:

i- میں گھر میں.....پالنے کا روادار نہیں۔

ii- انسان صرف روٹی پر ہی.....نہیں رہتا۔

iii- اختلاف کی.....نظر نہ آئی۔

iv- انسان محبت کا.....ہے۔

v- مرغ صرف صبح.....اذان دیتے ہیں۔